پیامِ آخریں

کیا مذہب کوئی نجی اور شخصی معاملہ ہے ؟ کیا آپ پسند کریں گے کہ اسلام کا بھی حشر بحیثیت اخلاقی و سیاسی تصور کے عالمِ اسلام میں وہی ہو جو یورپ میں مسیحیت کا ہوا ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام کو اخلاقی تصور کے طور پر تو باقی رکھا جائے مگر بحیثیت نظامِ حکومت کے اسے قومی سیاست کے حق میں مسترد کر دیا جائے جس میں مذہبی طرزِ فکر کو حصہ لینے کی کوئی اجازت نہ ہو ؟

اسلام بنیادی طور پر ایک مذہبی تنظیم ہے جس کے حدود قطعی واضح ہیں۔ خدا کے ایک ہونے پر ایمان۔ تمام انبیاء و مرسلین پر ایمان، محمد رسول اللہ کے خاتم النبیین ہونے پر ایمان — مؤخر الذکر عقیدہ دراصل وہ شرط ہے جس کے ذریعے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان ٹھیک ٹھیک حد قائم ہو جاتی ہے اور آدمی کسی فرد یا گروہ کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہوتا ہے وہ شخص یا گروہ اس تنظیم میں شامل ہے یا نہیں۔

سیاست کی جڑ آدمی کی زندگی میں گہری ہوتی ہے، یہ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام شخصی اور نجی رائے کی چیز نہیں ہے اسلام ایک سوسائٹی ہے یا اگر آپ چاہیں تو اُسے سیویک چرچ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اگر معاشرۂ انسانی کا مقصد یہی ہے کہ قوموں کے لیے امن اور تحفظ کا ضامن ہو اور ان کے اجتماعی ڈھانچوں کو کسی ایک نظامِ معاشرہ کی صورت میں منتقل کرے تو پھر نظام اسلامی کے سوا کسی دوسرے نظامِ معاشرہ کا تصور بھی آدمی کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جہاں تک میرا مطالعۂ قرآن ہے اسلام کا مقصد یہ نہیں ہے کہ صرف افراد کی اخلاقی اصلاح کر دی جائے بلکہ اس کا مقصود یہ بھی ہے کہ تدریجاً مگر بنیادی انقلاب بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی میں برپا کیا جائے۔ ان کے قومی اور نسلی تصورات کو بدل کر ان کی جگہ خالص انسانی شعور پیدا کیا جائے۔ مذہب کی تاریخ واضح طور پر یہ بتاتی ہے کہ زمانۂ قدیم میں مذہب "قومی" تھا

لہ یہ کوئی مستقل مضمون نہیں ہے بلکہ سید حسن مثنیٰ ندیم نیرو زکراچی نے علامہ اقبال کے مختلف مضامین کے بعض اجزا کو جوڑ کر ترتیب دیا ہے۔ (ادارہ)

جیسے مصریوں کا، یونانیوں کا، ایرانیوں کا، بعد میں وہ "نسلی" ہوگیا۔ جیسے بنی اسرائیل (یہودیوں) کا مذہب۔ ادھر مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ مذہب انفرادی اور شخصی معاملہ ہے۔ اور مذہب شخصی اور نجی عقائد کا مترادف ہوگیا تو یورپ نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ آدمی کی اجتماعی زندگی کی ذمہ دار فقط اسٹیٹ ہے مگر یہ تو اسلام اور صرف اسلام تھا جس نے پہلی مرتبہ بنی نوع انسان کو یہ پیغام دیا کہ مذہب نہ تو قومی اور نسلی چیز ہے نہ انفرادی اور شخصی بلکہ خالص انسانی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ باوجود فطری امتیازات کے وہ ساری انسانیت کو منظم اور متحد کرے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام صرف عقائد پر کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اسلام کوئی نظامِ کلیسا نہیں بلکہ خود ایک اسٹیٹ ہے اور اپنے منظم اور مرتب نظام کی صورت میں اس سے مدتوں پہلے وجود میں آیا جب کہ روسو کے خواب و خیال میں یہ بات آئی ـــــ اس نظام کے اندر روح و رواں اخلاقیاتِ عالیہ کے وہ اصول ہیں جو انسان کو ایسی کوئی مخلوق بالکل تصور نہیں کرتے جس کی جڑ کہیں کسی زمین میں گڑی ہوئی ہو اور جس کی شناخت کے لیے کسی نہ کسی خطے اور سرزمین کی نسبت ضروری ہو۔ یہ نظام انسان کو ایک ایسی نوعِ روحانی قرار دیتا ہے جو اپنی معاشرتی ہیئتِ ترکیبی اور اجتماعی ساخت کے توسط سے جانی پہچانی جاتی ہے اور پھر انسان اپنی اس معاشرتی ہیئتِ ترکیبی کے اندر ایک زندہ اور جاندار عنصر کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور صاحبِ حقوق اور صاحبِ فرائض بھی ہوتا ہے۔

اسلام وحدتِ انسانی کو مادہ اور روح کی مصالحت ناپذیر ثنویت کی شکل میں تقسیم نہیں کرتا، اسلام کے اندر خدا اور کائنات، روح اور مادہ، چرچ اور اسٹیٹ ایک دوسرے سے اسی طرح مربوط ہیں جیسے نظامِ جسمانی میں اعضا و جوارح۔ انسان کسی ایسی ناپاک دنیا کا باشندہ بھی نہیں ہے کہ وہ روح اور روحانیت کی اس پاکیزہ دنیا کی خاطر جو کہیں اور واقع ہو، اس دنیا کو ترک کر دے۔ اسلام کے نزدیک تو مادہ ہی روح ہے، اگر وہ اپنے آپ کو زمان و مکان میں منقلب کر لے۔ مگر یورپ نے مادہ و روح کی ثنویت کو نقد و نظر سے کام لیے بغیر قطعی غیر امتیازانہ طور پر قبول کر لیا ہے اور اغلباً یہ اثر اس پر (خیر و شر دونوں کو ازلی ماننے والے) ثنویت پرستوں (مجوسیوں) کے فلسفے کا پڑا ہے۔ چنانچہ آج یورپ کے بہترین مفکروں کو اس بنیادی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے مدبرین بالواسطہ طور پر مصر ہیں کہ اس فکر کو ایک ناقابلِ تردید عقیدے کی حیثیت سے ساری دنیا قبول کر لے۔

اگر بعض مسلمان بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مذہب اور نیشنلزم ایک سیاسی نظریہ اور تصور کی حیثیت

سے دوش بدوش چل سکتے ہیں تو میں بروقت انتباہ کیے دیتا ہوں کہ یہ طریقہ بالآخر لامذہبیت تک پہنچائے گا اور بالفرض ایسا نہ بھی ہو تو لازمی نتیجہ اس کا یہ ضرور ہوگا کہ اسلام فقط ایک اخلاقی تصور اور فلسفہ بن کے رہ جائے گا جس کو اپنے نظامِ معاشرت اور دستورِ اجتماعی سے مطلق کوئی سروکار باقی نہ رہے گا۔

میں اس کا مخالف ہوں کیونکہ اس میں جراثیم ہیں اس ملحدانہ مادیت کے جو میرے نزدیک عہدِ جدید کی انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

حُبّ الوطنی بجا طور پر ایک فطری وصف ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کا ایک مقام بھی ہے مگر اس کے باوجود واقعہ یہی ہے کہ جو چیز حقیقتہً قابلِ قدر ہے وہ ہے آدمی کا عقیدہ و ایمان، اس کی تہذیب و ثقافت، اس کی تاریخ و روایات - اور یہ چیزیں وہ ہیں کہ میری نظر میں آدمی زندہ رہے تو ان کے لیے زندہ رہے اور جان دے تو ان کے لیے جان دے نہ کہ زمین کا وہ ٹکڑا جس کے ساتھ روحِ انسانی کا رشتہ بالکل وقتی اور عارضی ہوا کرتا ہے۔

اسلام چونکہ ایک نظام القوانین ہے معاشرۂ انسانی کا، اس لیے لفظ "ملک" جب کبھی سیاسی نظریہ کے طور پر استعمال کیا جائے گا اسلام سے اس کا تصادم ناگزیر ہے۔ اسلام کوئی مصالحتِ عملی تسلیم نہیں کرتا وہ کسی دوسرے نظام القوانین سے مفاہمت کے لیے آمادہ نہیں ہے جو معاشرۂ انسانی کے نظم و نسق کا مدعی ہو، واقعتاً اسلام کا اعلان ہے کہ ہر وہ نظامِ قانونی جو اسلام کے نظامِ قانونی کے علاوہ ہو ناقص اور نامنظور ہے۔

لہٰذا اسلام کا مذہبی تصور اور مطمحِ نظر (آئیڈیل) نظامِ جسمانی کی طرح اس نظامِ اجتماعی سے مربوط ہے جس کی تخلیق اس نے خود کی ہے جس کی وجہ سے اس کا استرداد لازمی طور پر مستلزم ہے۔ دوسرے کے استرداد کو، اسی لیے نیشنل لائنوں پر نظامِ حکومت کی تعمیر اگر اس کے معنی یہ ہوں کہ احساسات و جذبات، اعمال و افعال اور مفادات و حقوق کے اسلامی اصولوں کا استیصال ہو جائے تو پھر ایک مسلمان کے لیے صریحاً ناقابلِ تصور ہے۔

ہم لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اسلام بحیثیت مذہب تو منزل من اللہ ہے لیکن اس کا وجود بحیثیت معاشرہ و اجتماع یا قوم کلیتہً مبنی اور منحصر ہے پیغمبرِ خدا کی شخصیت پر۔ جن لوگوں نے پیغمبرِ خدا کی رہنمائی قبول کر لی وہ کسی قوم یا ملک کے ہوں پہلے وہ ملک و نسل کے محکوم تھے اب ملک و نسل ان کے محکوم ہو گئے۔

یقین کیجیے کہ مذہب اسلام ایک ایسی غیر مرئی اور نامحسوس مدِ حیاتی و نفسیاتی قوت ہے جو کسی مبلغ کے سہارے کے بغیر انسانیت کے افکار و اعمال پر اپنا اثر کیے جاتی ہے۔ عصرِ حاضر کے سیاسی مفکرین کا اپنی بدعات و اختراعات

کے ذریعہ اس قسم کی چیز کو جراحت پہنچانا درحقیقت انسانیت کے خلاف تشدد اور دست درازی ہے اور اس پیغامِ نبوی کی ہمہ گیری کے خلاف بھی جس نے اُسے وجود بخشا ہے۔ تاریخ کے طلبہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام کا ظہور ایسے زمانے میں ہوا تھا جب انسانی وحدت و اتحاد کے پرانے اصول مثلاً رشتۂ خون اور تہذیب تخت و تاج وغیرہ سب ناکام ہو چکے تھے۔ اسلام نے بتایا کہ وحدتِ انسانی کے اصولوں کے مرکز خون اور ہڈیاں نہیں بلکہ انسانی ذہن و فکر ہیں۔

آپ اُسے خالص نظریاتی گفتگو نہ سمجھیں، اسلام آج بھی ایک زندہ قوت اور عملی شے ہے۔ میرا ایمان ہے کہ فرد کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی چیز مذہب ہی ہے بلکہ مملکتوں کی زندگی میں بھی، میرے نزدیک اسلام خود ایک منزلِ مقصود ہے اور آج بھی اس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ ایک نئی دنیا تخلیق کر کے رکھ دے، ایسی دنیا جہاں انسان کے لیے اجتماعی اور معاشری مرتبہ کے لیے ذات پات، یا رنگ روغن یا دولت نہیں بلکہ اس کی طرز زندگی میزان و معیار ہو، جہاں غریبوں کی طرف سے امیروں پر ٹیکس لگتا ہو، جہاں معاشرۂ انسانی کی بنیاد معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو جہاں شخصی ملکیت ایک وقف ہو اور راس المال کو اس حد تک ارتکاز کی اجازت ہی نہ ہو کہ وہ حقیقی صرفِ دولت پر تسلط جما سکے۔

ہر قوم کے لیے راستہ کھلا ہے کہ وہ چاہے تو اپنی اجتماعی تعمیر کے بنیادی اصولوں میں ترمیم کرے۔ یا ان کی نئی تعبیر پیش کرے یا چاہے تو اس کو مسترد بھی کر دے۔ لیکن کسی نئے تجربے کی مہم شروع کرنے سے پہلے اس کو خوب اچھی طرح سوچ لینا ضروری ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اسلام کے جیسی سوسائٹی میں پرانے اداروں پر نظرثانی کرنے کا معاملہ تو اور بھی زیادہ نازک ہے۔ اسلام اپنی نوعیت سے ایک غیر خطہ واری نظام ہے اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی باہمی متضاد اور برسرِ پیکار نسلوں کو شیر و شکر کرنے کا ایک آخری امتزاجی نقشہ غط کرے اور منتشر ذرات انسانی کو ایک ایسی قوم کی صورت بخش دے جو شعورِ خودی سے مالا مال ہو۔ یہ مہم آسان نہ تھی۔ اس قسم کی سوسائٹی کے ارتقا میں بظاہر بہت چھوٹے چھوٹے بے ضرر اعمال و رسوم بھی، جن کا تعلق کھانے پینے اور طہارت و نجاست وغیرہ سے ہے، بجائے خود بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ سوسائٹی کی ایک واضح اندرونی فضا دراصل انہی کی مدد سے تشکیل پاتی ہے اور پھر یہی چیزیں ہیں جن کے ذریعہ وہ خارجی اور داخلی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جس سے اس نوعیت کی سوسائٹی میں ہر لمحے لہرانے والی غیر متجانس قوتوں کا

توڑ ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے ان اداروں پر تنقید کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اسلام کے اجتماعی تجربات کے مقصدِ آخریں کو سمجھنے کی بصیرت پہلے حاصل کریں، ان اداروں پر نظر اس طرح ہرگز نہ ڈالی جائے کہ فلاں ملک میں ان سے یہ فائدہ ہوگا یا فلاں ملک میں ان سے یہ نقصان ہوتا ہے۔ بلکہ انسانی زندگی میں جو ایک تدریجی عمل جاری و ساری ہے اس کا وسیع تر مقصود ان کی نگاہوں کے سامنے ہو۔

اس بات کو فراموش نہ کیجیے کہ زندگی فقط تغیر و تبدل کا نام نہیں ہے۔ زندگی اپنے اندر تحفظ و قدامت کے عناصر بھی رکھتی ہے۔ اُسے دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ زندگی اپنی پشت پر ماضی کا وزن لے کر ہی آگے بڑھتی ہے اس لیے سماجی تغیر و تبدل کے کسی تصور میں بھی تحفظ کی قوتوں کے عمل دخل اور ان کی قدر و منزلت کو نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہیے۔ کوئی قوم بھی اپنے ماضی سے کٹ جانا ہرگز برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ ماضی اس کے تشخص کا دوسرا نام ہے۔

آج انسانیت تین چیزوں کی سخت محتاج ہے، ایک تو یہ کہ کائنات کی روحانی تعبیر کی جائے۔ دوسرے یہ کہ افراد کو حریتِ روحانی حاصل ہو، تیسرے یہ کہ روحانی اساس پر معاشرۂ انسانی کے ارتقا کے لیے عالمگیر اصول اساسی مہیا ہوں۔ لیکن یقین کیجیے کہ انسان کی اخلاقی ارتقا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آج خود یورپ ہے — لہٰذا مسلمانوں کو اپنی پوزیشن خود سمجھ کر، بلند تر فکر اور اپنے اصولِ آخریں کی روشنی میں سوشیل لائف کی تشکیل خود کرنی چاہیے۔

اسلام اور فطرت

از مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے لیکن فطرت کیا ہے اور اسلام کیونکر فطرت کے مطابق ہے۔ اس کتاب میں اسی اہم موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

صفحات ۱۲۴+۸ قیمت ۲/۷۵ روپے

ملنے کا پتہ :- ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔